اس کے، جس نے تصویریں کی تھی، پیٹ کے پار ہو گئی۔ دوسرے کی تلوار اس کے ساتھی کی پسلیوں میں اٹک گئی۔ دونوں گرتے ہی ختم ہو گئے۔ میں واقعے کی سرعت کی وجہ سے ششدر رہ گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ابھی ابھی میں نے ان غیر ملکیوں سے روپیہ قبول کیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ سوار مجھ پر بھی حملہ آور ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے روپیہ اندرونی جیب میں رکھا اور ٹوکری اٹھا کر وہاں سے کھسک آیا۔ اگلے بازار میں میں نے تین اور لاشیں دیکھیں جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پڑی تھیں۔ ان کے چہرے ابھی گرم تھے۔ وہ بھی تینوں غیر ملکی تھے، جن کے سنہرے بال خون اور گرد کی وجہ سے بدرنگ ہو رہے تھے۔ ان کے پاس کیمرے نہیں تھے۔ کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے ہاتھ خالی تھے۔ بازار میں لوگ عجلت سے دکانیں بند کر رہے تھے۔ چند ایک لاشوں کے آس پاس کھڑے تھے اور ان کے چہرے بچوں کی طرح زرد اور خوفزدہ تھے۔ مجھے ان لوگوں کی حالت پر بڑا ترس آیا کیونکہ میں اس سے کہیں بڑے بڑے موقعے دیکھ چکا تھا اور یہ صورت حالات میرے لیے معمولی تھی۔ چنانچہ ان میں دلچسپی لیے بغیر میں وہاں سے گزر گیا، بلکہ میں نے اپنا کاروبار بھی [illegible] مچھلی کی آواز [illegible]۔ دربار صاحب کے بڑے دروازے کے سامنے میں نے ایک اور انگریز کو دیکھا جو مر رہا تھا۔ ایک پتلی سی چھری اس کی گردن کے آر پار ہو چکی تھی اور وہ اس کے دستے کو پکڑے جان کنی کی حالت میں سے گزر رہا تھا۔ دوپہر کے وقت شہر کا سب سے بڑا چوک ویران پڑا تھا اور آس پاس کوئی جان دار دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں وہاں سے بھی گزر گیا۔ لیکن وہ بڑا خوبصورت لڑکا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود [illegible] نے [illegible]۔ مرتے ہوئے اس شخص کا چہرہ آسمان کی طرف تھا اور نوجوان ہونٹ سرد ہو چکے تھے۔ بچو! تم خوش قسمت ہو کہ ابھی نوجوان ہو اور لاعلم ہو۔ میں بڑھاپے والا ہوں۔ لیکن ایک زمانہ گزار چکا ہوں اور زندگی کی چند ایک باتوں کا علم رکھتا ہوں۔ نوجوان چہرے اور آنکھیں اور [illegible] دنیا کی خوش نما چیزیں ہیں۔ لیکن جب وہ سرد کر دیے جاتے ہیں۔ میں نے مچھلیاں دیکھی ہیں جو موت میں بھی آنکھیں کھول کر مسکراتی رہتی ہیں مگر نوجوان۔ ان کی دوسری بات ہے۔ اس سے انسان کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کا خیال دل سے نکالنے کے لیے میں نے زور سے مچھلی کی آواز لگائی۔ اسی طرح کچہری تک پہنچتے پہنچتے میں نے تین اور لاشیں دیکھیں جو نالیوں کے کنارے اور پٹریوں پر پڑی تھیں۔ اور لاشوں کے علاوہ میں نے ایک آگ دیکھی، پوشیدہ اور خاموش آگ جو سڑکوں اور گلیوں اور بازاروں میں دوڑتے ہوئے شہریوں کے درمیان لپک رہی تھی۔ آگ جو جسموں کے بجائے دلوں اور آنکھوں میں لگی تھی۔ ایک خوفناک غصہ جو تمام شہریوں کے سروں پر لہرا رہا تھا اور میں تمہیں سچ بتاتا ہوں بچو! تم نے نہیں دیکھا میں نے دیکھا ہے۔ میں نے ہزار ہا مردہ انسان اور جوان اور مچھلیاں دیکھی ہیں، اور سرخ وبا میں ایک ایک دروازے سے تین تین مردے بیک وقت نکلتے اور عورتوں کو ماتم کرتے ہوئے دیکھا ہے، اور جب ریل گاڑیوں کی ٹکر ہوئی تو میں وہاں پر موجود تھا اور میں نے دیکھا کہ ایک آدمی کی گردن کے پاس دوسرے کا سر پڑا تھا، اور میں نے بچے چلاتے اور ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہوئے قافلوں کو دیکھا ہے مگر کبھی خوفزدہ نہیں ہوا۔ کبھی نہیں، کیونکہ اس میں خوفزدہ ہونے کی کوئی بات ہی

نہیں لیکن وہ خاموش اور دبا ہوا غصہ جو اس شہر کے ہر نفس ہر جاندار اور ہر چیز میں سانس لے رہا تھا اسے دیکھ کر میں گھر چلا آیا۔

''اس وقت سے شہر کا تمام کاروبار بند ہوگیا اور سڑکوں پر اور بازاروں میں فوجی ٹرک اور گورے سپاہی پھرنے لگے اور شہر کے باشندے جو چپے چپے پر بکھرے ہوئے تھے اب گلیوں، کونوں اور محلوں کے اندر گروہوں میں اکٹھے ہونے لگے جیسے ایک مچھلی کے جال کو قینچی سے بیچ میں سے کاٹ دیا جائے تو جگہ جگہ سے گچھوں میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اور انہی میں سے ایک گروہ تھا جس نے کہ بھرے بازار میں اس انگریز عورت کی بے حرمتی کی جو فساد کی جڑ بنی۔ یہ انتشار کا تیسرا روز تھا۔ میں حسب معمول مچھلیاں اٹھائے پھر رہا تھا۔ اور دل میں کڑھ رہا تھا کیونکہ ان میں سڑاند پیدا ہو چکی تھی اور مجھے ان سے نفرت ہو رہی تھی۔ لیکن میں نے ہوشیاری سے کام لے کر اب آواز لگانی بند کر دی تھی۔ کیونکہ کئی دن گزر جانے پر اب ان میں خوبیاں کم ہی رہ گئی تھیں، اور اس امید میں انہیں لئے چپ چاپ پھر رہا تھا کہ شاید کوئی نیک دل شوقین انہیں خرید لے۔ بڑے بازار میں جب اس گلی کے مقابل پہنچا جو بازار کو سبزی منڈی کے ساتھ ملاتی ہے تو ٹھٹک کر رک گیا۔ گلی میں سے ایک گوری عورت دوڑتی ہوئی نکل رہی تھی۔ اس کے پیچھے شہریوں کا ایک گروہ شکاری کتوں کی طرح لگا ہوا تھا۔ بازار کے وسط میں انہوں نے عورت کو آلیا۔ چاروں طرف سے اسے گھیر کے وہ پلید نظروں سے اسے گھورتے رہے۔ عورت کے بال راکھ کے رنگ کے تھے اور اس کی اوڑھنی غائب تھی۔ اس [illegible] کی طرح آہستہ آہستہ ایڑیوں پر گھوم رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید مچھلی کی طرح بے جان تھا۔ کچھ دیر تک ہجوم خاموش رکا کنکھیاں چمکاتا رہا۔ پھر ایک شخص آگے بڑھا اور عورت کی قمیض کو گلے سے پکڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دامن تک پھاڑ دیا۔ عورت نے چیخ ماری جس سے سارا طلسم ٹوٹ گیا اور مجمع اس پر پل پڑا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ بیس پچیس آدمیوں کے پیچھے غائب ہوگئی لیکن اس کی چیخیں زمین کے ساتھ ساتھ مجھ تک پہنچتی رہیں۔ میرے سامنے وہ سب اسے کوؤں کی طرح نوچتے رہے۔ مگر وہ عجب سخت جان ربڑ کی عورت تھی بھئی واہ وا۔ میں نے اس سے زیادہ عجیب و غریب عورت آج تک نہیں دیکھی۔ ادھر ہجوم کا دباؤ ذرا کم ہوا ادھر وہ اچھل کر ان کے بیچ میں سے نکلی اور ایک طرف کو بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے بدن پر پھولدار قمیض کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف اس کے چوتڑوں پر ہلکا سا زیر جامہ اور چھاتی پر عورتوں کے پہننے کا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ اس کے بال سر پر کھڑے تھے اور وہ ٹانگیں پھیلا کر پوری رفتار سے چڑیلوں کی طرح بھاگ رہی تھی۔ اس کے پتلے ہوئے سفید کولہے اور رانیں ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہل رہی ہیں۔ آہ۔ اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ یہ عورت اگر شام کے وقت گھر میں بیٹھ کر مچھلی کھا رہی ہو تو شاید آنکھوں کو بھلی لگے۔ آہ۔ اس کے بعد وہ گروہ اسی گلی میں غائب ہوگیا۔ میں دل میں انہیں لعنت ملامت کرتا ہوا واپس چلا آیا۔

''اس رات پہلی بار مجھے اچھی طرح سے نیند نہ آئی۔ اس سے پہلے مجھے یاد نہیں کہ کبھی میری نیند میں خرابی

ہوئی ہو۔ میں خوب سونے کا عادی ہوں کیونکہ نیند صحت کے لئے مفید ہوتی ہے۔ لیکن اس رات میں خشکی کے مارے ہوئے مریضوں کی طرح جاگتا رہا۔ پھر مجھے اپنی صحت کے متعلق بڑا فکر ہوا۔ پہلے میں نے آگ جلا کر کمرے کو خوب گرم کیا۔ پھر بچی کھچی مچھلیوں کو آزاد چھوڑ کر دیوار کے ساتھ کھڑا کیا تاکہ گلنے نہ پائیں۔ پھر کونے میں جا کر چٹائی پر لیٹ گیا جو کہ میری روزانہ سونے کی جگہ ہے۔ لیکن نیند نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ یہ شاید سڑاند کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ میں اٹھا اور مچھلیوں کو ایک ڈھیر میں اکٹھا کر کے ٹوکری کے نیچے ڈھک دیا۔ پھر اپنی مقررہ جگہ پر واپس آ کر داہنی کروٹ لیٹ گیا۔ کیونکہ اس طرح میں گہری نیند سوتا ہوں۔ نیند پھر بھی نہ آئی۔ میں اٹھ کر چٹائی آگ کے قریب لے گیا۔ مگر چند ہی سانس لئے ہوں گے کہ گرمی کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اب میں اکڑوں بیٹھا تھا اور اپنی جسمانی حالت پر غور کر رہا تھا کہ سوچتے سوچتے مجھے ایک تجویز سوجھی۔ میں نے ٹوکری اٹھائی اور گندی مچھلیوں کو چن چن کر ایک طرف رکھا۔ ''نیند تو آتی نہیں۔ آؤ تم سے گپیں ہی ماریں۔ میں نے کہا اور ایک سڑی ہوئی مچھلی اٹھائی۔ مچھلی کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''میرا باپ زندہ ہوتا تو تمہیں مرنے سے پہلے ہی چھوڑ دیتا۔ لیکن میں تمہیں آسانی سے نہیں چھوڑنے کا۔ کان کھول کر سن لو۔'' میں نے کہا۔ ''تم لاکھ ہنسو لیکن تمہارے بچے اور دوسرے رشتہ دار تمہاری موت پر آنسو بہا رہے ہوں گے۔'' مچھلی اسی طرح ہنستی رہی۔ مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ ''تم سوتی نہیں؟ بے آرام جانور۔ تمہیں مرے بھی ایک عرصہ [illegible] لو......'' یہ کہہ کر میں نے اسے آگ میں اچھال دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں خشک مچھلی تڑ تڑ کر جلنے لگی۔ مگر اس کی آنکھیں اسی طرح کھلی تھیں اور آگ میں پڑی ہوئی وہ ابھی تک ہنس رہی تھی۔ میں نے غصے میں دوسری مچھلی کو بھی اٹھا کر آگ میں پھینکا۔ یہ مقابلتاً سنجیدہ چہرے والی مچھلی تھی لیکن یہ بھی جاگ رہی تھی۔ جلتی ہوئی مچھلی کی چربی کی بو ہر طرف پھیل رہی تھی جو کہ اگر تم نے کبھی سونگھی ہے تو تمہیں پتا ہوگا کہ کافی اشتہا آور ہوتی ہے مگر آدھی رات کے وقت میں نے زیادہ کھانا مناسب نہ سمجھا اور بھوک کو کسی اور وقت پر ٹال کر ایک اور مچھلی اٹھائی۔

''تمہاری جلد بڑی خوبصورت اور نرم ہے۔ شاید کوئی گاہک مل جائے۔ تم آرام کرو۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔

''یہ تجویز کارگر ثابت ہوئی اور کافی دیر تک ان کے ساتھ گپ شپ کرنے اور ناکارہ مچھلیوں کو جلانے کے بعد میں خود بخود سو گیا۔

''صبح جو سو کر اٹھا تو سورج سر پر آن پہنچا تھا اور باہر چہل پہل تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ آج کئی روز کے بعد سڑکیں آباد ہوئی تھیں۔ میں نے اچھی طرح سے آنکھیں مل کر نیند کو دفع کیا۔ وہ سب بڑی جلدی میں تھے اور ایک ہی طرف کو جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مچھلی کی نیلامی شروع ہو چکی ہے اور وہ اس فکر میں ہیں کہ اچھی اچھی مچھلی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ لیکن ایک بات جس سے وہ مچھلی کے گاہک معلوم نہ ہوتے تھے ان کی خاموشی تھی۔ وہ بات

کیے اور شور مچائے بغیر تیز تیز چل رہے تھے۔ ان میں ہر قسم کے لوگ تھے: بڈھے جوان' چھوٹے بڑے' پتلے موٹے' لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ سب کے رنگ زرد تھے اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہ رہے تھے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے جستجو ہوئی۔ جلد جلد ٹوکری میں مچھلیاں بھر کر باہر نکلا اور ان میں شامل ہوگیا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ دی' پھر بھی میں نے ہونٹ بھینچ لئے اور انہی کی طرح اکڑ کر چلنے لگا۔ وہ تعداد میں بے شمار تھے۔ آگے اور پیچھے حد نظر تک ان کی قطاریں تھیں اور وہ ہر طرف سے آ رہے تھے۔ اسی طرح چلتے چلتے ہم بازار کے منہ پر پہنچ گئے۔ وہاں پر بہت سے مسلح گورے سپاہی کھڑے تھے۔ جب ہمارا ہجوم بازار میں داخل ہونے کو بڑھا تو انہوں نے سنگینیں باندھ لیں اور ادھر ادھر بکھر کر میدان جنگ کی طرح مورچہ لگا لیا۔ ہم ڈر کر رک گئے۔ پھر بازار میں سے ہندوستانی لاٹھی بردار پولیس کا ایک دستہ برآمد ہوا جس نے ہم پر لاٹھیاں برسانی شروع کیں جو کسی کو لگیں کسی کو نہ لگیں' لیکن اس سے یہ ہوا کہ ہم بازار میں داخل نہ ہو سکے۔ ایک لاٹھی میری ٹوکری پر لگی جس سے وہ گر پڑی اور ساری مچھلیاں بکھر گئیں۔ انہیں اکٹھا کرتے ہوئے چند لاٹھیاں میری پیٹھ پر بھی پڑیں لیکن میں نے ساری مچھلیوں کو اکٹھا کر کے چھوڑا۔ جب میں اٹھ رہا تھا تو میرے کان میں گونجدار نعروں کی آواز آئی۔ یہ ایک دوسرا ہجوم تھا جو مخالف سمت سے آ کر بازار میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس کو بھی لاٹھیوں کی مدد سے روکا گیا اور وہ ہمارے ساتھ آ ملا۔ ان کے آ کر ملتے ہی ہمارے لوگوں کی زبانوں میں جان پڑ گئی اور گونگا مجمع یکبارگی پوری طاقت سے چلا اٹھا۔ [illegible] رہے تھے جہاں اس وقت موجود ہیں۔ میرے چاروں طرف لوگ دھکم پیل کر رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے اب خوف و ہراس غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ خون اور جوش ابھر آیا تھا۔ ان کے منہ گرد آلود تھے اور بار بار دل دہلا دینے والی آواز میں کھل رہے تھے۔ ہم دیر تک اچھل اچھل کر اور چھلانگیں لگا کر چلتے ہوئے اور شور و غل مچاتے ہوئے سڑکوں پر بڑھتے رہے۔ راستے میں کئی چھوٹے چھوٹے ہجوم ہمارے ساتھ آ کر مل گئے اور کئی جگہ مسلح سپاہیوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی۔

''جب ہم یہاں داخل ہوئے تو باغ میں انسانوں کا ایک سمندر تھا جس کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ ہم سے پہلے بھی یہ بھرا ہوا تھا' جب ہم داخل ہوئے تو بھی یہ بھرا ہوا تھا' اور ہم سے بعد میں بھی گھنٹوں اس میں لوگوں کا سیلاب داخل ہوتا رہا اور یہ بھرا ہی رہا۔ گرد کا ایک طوفان پاؤں تلے سے اٹھ اٹھ کر سروں پر منڈلا رہا تھا۔ لاکھوں لوگوں نے قیامت کا شور مچا رکھا تھا اور انتشار کا یہ عالم تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔ گرد میری ناک میں گھس رہی تھی اور میرے پاؤں ہزاروں پاؤں کے نیچے کچلے جا رہے تھے اور کھلی بہار میں بھی میرے سر میں سے پسینے کی دھاریاں بہہ رہی تھیں۔ میں ان کو کوس بھی رہا تھا لیکن وہاں سے نکلنا بھی مشکل تھا۔ اس ریلتے پیلتے اور شور مچاتے ہوئے مجمعے میں میں واحد شخص تھا جس کے سر پر ٹوکری تھی اور مجھے اس بات پر دل میں شرم محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اسی وقت میری نظر بارہ سال کے ایک بچے پر پڑی جو شاید اپنے باپ سے بچھڑ گیا تھا اور ہجوم میں دھکے کھا رہا تھا اور

رو رہا تھا۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر گرتا پڑتا میں اسے ایک طرف لے گیا۔ وہ روتا رہا۔ میں نے ٹوکری میں ٹٹول کر ایک اچھی سی مچھلی نکالی اور اس کے ہاتھ میں تھمائی جسے دیکھ کر وہ چپ ہو گیا اور خوش خوش ایک طرف کو چل پڑا۔ پھر میں نے سوچا کہ ٹوکری لے کر آنے کے یہ فائدے ہیں۔

"دروازے میں سے ابھی تک چلاتے ہوئے لوگ داخل ہو رہے تھے۔ مسلمان اپنے خدا اور مذہبی رہنماؤں کا نام لے کر اور ہندو اور سکھ اپنے خداؤں کو پکار پکار کر نعرے لگا رہے تھے۔ جب میں مڑا تو سب لوگ ایک سیاہ داڑھی والے شخص کی طرف دیکھ رہے تھے جو ایک اونچی جگہ پر کھڑا مجھے کو چپ کرانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کی داڑھی ہوا میں ہل رہی تھی لیکن وہ اپنی کوشش میں کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پیچھے ایک گورا نمودار ہوا جس نے فوجی افسروں کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس نے دھکا دے کر کالی داڑھی والے کو نیچے گرا دیا اور اسی کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی اور اس کی انتہائی غصیلی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی لیکن اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ وہ ہمیں وہاں سے دفع ہو جانے کو کہہ رہا ہے۔ اچانک شور پھر بلند ہوا اور اس کی آواز دب گئی۔ ایک طرف سے کسی نے جوتا اتار کر اس کی طرف پھینکا۔ پھر ہر طرف سے جوتوں کی یلغار شروع ہوئی۔ ساتھ ساتھ مجمع مسلسل حرکت میں تھا۔ کیونکہ اس دھکم پیل میں ایک جگہ رکنا سخت مشکل تھا۔ اب آس پاس سے ہزاروں ننگے اور پرانے جوتے پھینکے جا رہے تھے اور [illegible] ایک [illegible] کے لئے اندھیرا کر دیتی ہے...... [illegible] فوجی افسر کے ارد گرد کے لوگ ڈرے ہوئے چپ چاپ کھڑے تھے اور پیچھے سے آنے والے جوتے ان کے سروں پر پڑ رہے تھے۔ اس وقت میں نے ہوشیاری سے کام لے کر اپنے جوتے سنبھال کر رکھے کیونکہ میرے پاس، تم جانتے ہو کہ جوتوں کا صرف ایک ہی جوڑا ہے۔ جب جوتے ختم ہو گئے تو لوگوں نے اپنے کپڑے اتار اتار کر پھینکنے شروع کر دیے۔ اب پگڑیوں، قمیضوں اور بنیانوں کے گولوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور جلد ہی آدھے سے زیادہ لوگ ننگے بدن ہو گئے بلکہ بعض تو بے حیائی سے کام لے کر سب کچھ ہی نکال کر پھرنے لگے۔ جب سب کچھ ختم ہو گیا تو صرف شور باقی رہ گیا جو کہ ہجوم اور وہ فوجی افسر مل کر مچا رہے تھے۔ اتنے میں میرے آگے کھڑا ہوا ایک شخص مڑا اور میری ٹوکری کی طرف بڑھا۔ میں پیچھے ہٹا تو عقب سے دس بارہ ہاتھوں نے ٹوکری گھسیٹ لی اور اس میں سے مچھلیاں اٹھا کر خونبار نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر پورے زور سے انہوں نے مچھلیاں ہزاروں انسانی سروں کے اوپر سے اس طرف کو پھینکیں۔ جن لوگوں پر وہ گریں انہوں نے اٹھا کر آگے پھینکیں، پھر آگے، اور آگے، اور اسی طرح ایک مچھلی جا کر فوجی افسر کی آنکھوں کے درمیان لگی۔ اس نے وہیں پر اسے پکڑ لیا اور ایک لمحے تک اسے دیکھتا رہا، پھر سر اٹھا کر مجمعے کو دیکھا، پھر مچھلی کو، پھر مجمعے کو۔ دفعتاً اس نے مچھلی سر سے بلند کی اور پوری طاقت سے اسے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے منہ پر کھینچ مارا۔ پھر اس نے بازو ہوا میں پھینکے اور پاگلوں کی طرح چیخ مار کر چلایا۔ اسی وقت گولی چلنی شروع ہوئی۔

''پھر وہ منظر شروع ہوا جو زندگی میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ہمارے باغ میں افراتفری پھیل گئی اور وہ بھگدڑ مچی جو صاف پانی میں جال پھینکنے پر مچھلیوں میں مچتی ہے۔ لیکن پیچھا کرتی ہوئی گولیاں انسانوں سے بہت تیز بھاگتی ہیں بچو!...... ایک وہ شخص تھا جو میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے دوڑ رہا تھا' گولی لگنے پر ہوا میں اچھلا اور وہیں پر ٹنگ گیا' کیونکہ نیچے آنے سے پہلے چند اور گولیاں اس کے جسم میں داخل ہوئیں اور اس نے ہوا میں قلابازی کھائی' پھر اور گولیاں اور ایک اور قلابازی اور اس طرح جب سرکس کے مسخرے کی طرح کرتب دکھانے کے بعد وہ زمین پر آیا تو کب کا مر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی جوش و خروش تھا اور وہ بدشکل نہ ہوا تھا' کیونکہ اس نے موت دیکھی ہی نہ تھی۔ یہ عجیب و غریب موت تھی۔ دیکھتے دیکھتے اس کا جسم گرتی ہوئی لاشوں میں چھپ گیا۔ یہ سارا قصہ چند لمحے کا ہے۔ وہاں سے آندھی کی طرح بھاگتے ہوئے مجھے اپنی نوکری دکھائی دی جو گولیاں لگنے پر گیند کی طرح اچھل رہی تھی۔ پھر بھاگتے بھاگتے میں تیج مار کر رک گیا۔ چند گز کے فاصلے پر وہ کنواں تھا۔ وہ خشک کنواں تم دیکھ رہے ہو؟ ہاں وہی۔ میرے ساتھ بھاگتے ہوئے زیادہ تر لوگ اس میں جا گرے۔ ان کے اوپر دوسری طرف سے آنے والے گرے۔ پھر اس میں ہر طرف سے آنے والے زندہ اور مردہ لوگ گرنے شروع ہوئے اور انسانوں کی چیخوں نے گولیوں کی آواز کو دبا دیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے کنواں مردہ اور نیم مردہ لوگوں سے بھر گیا اور لوگ آسانی کے ساتھ اس پر سے دوڑتے ہوئے گزرنے لگے۔ گولیوں کی بوچھاڑ کے نیچے نیچے دوڑتا ہوا میں اس دیوار کے پاس سے [illegible] بچو؟ [illegible] اس وقت اس ساری دیوار پر لوگ لٹکے ہوئے تھے۔ ان کی ٹانگیں دیوار سے اندر کی طرف تھیں اور سر اور بازو باہر کی طرف لٹک رہے تھے اور ان کے پیٹ دیوار پر تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دیوار کو اس جگہ سے نیچا دیکھ کر پھاندنے کے لئے اوپر چڑھے اور گولیوں کی زد میں آ گئے اور اندر سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتے تھے جیسے دھوبی نے بے شمار پاجامے اور کوٹ اور پتلون سوکھنے کے لئے دھوپ میں پھیلا دیئے ہیں۔ تم نے دیوار میں یہ سوراخ دیکھے ہیں؟ آؤ۔ تم جو یہ سب باتیں لوگوں سے پوچھتے پھرتے ہو بچو' تم کبھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس باغی شہر کو کتنی بڑی سزا ملی۔ آؤ...... باہر نکلتے ہوئے مجھے چند کتے دکھائی دیئے جو ایک مچھلی کو کھینچ رہے تھے۔ یہ وہی سفید اور چمکدار مچھلی تھی جو میں نے اس خیال سے الگ کر دی تھی کہ شاید کوئی گاہک مل جائے۔ اس وقت اس کے ایسے انوکھے گاہک دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ لیکن ہنسنے کا وقت نہ تھا اس لئے میں جان بچانے کی خاطر سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ آیا۔

UrduPhoto.com

''بھاگتا بھاگتا میں اس جگہ پہنچا جہاں ایک روز پہلے اس گوری عورت کی مٹی پلید کی گئی تھی۔ وہاں پر تمام مجمع رکا ہوا تھا۔ عقب سے گولیاں چلنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ جب میں ہجوم کو چیر کر آگے بڑھا تو عجیب منظر دیکھا۔ بازار کے دونوں طرف گورے سپاہیوں کی قطاریں شست باندھے گولی چلانے کے لئے تیار کھڑی تھیں اور بازار کے بیچوں بیچ انسانی جسموں کا ایک دریا تھا جو بہہ رہا تھا۔ وہ سب زمین پر لیٹ کر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے پچیس گز کا وہ ٹکڑا طے کر رہے تھے۔ انہیں کہنیوں یا گھٹنوں سے کام لینے کی بھی اجازت نہ تھی۔ انہیں بتایا گیا اور ہم

سب کو بتایا گیا کہ انہیں سانپ کی طرح پیٹ پر چل کر یہاں سے گزرنا ہے جہاں پر کہ ان کی عورت کے ساتھ سانپوں کا سا سلوک کیا گیا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ جو کوئی بھی کہنیوں پر اٹھتا اور جو کوئی بھی گھٹنوں پر اٹھتا اسے گولی مار دی جاتی اور پھر انہوں نے ایسا کیا کہ بازار کے ایک طرف جمع ہو کر رینگتے ہوئے جسموں کے عین اوپر گولی چلانا شروع کر دی اور جان بچانے کے لئے بھگوڑوں نے مٹی میں سر گاڑ دیئے اور پاؤں کی انگلیوں اور ناخنوں کی مدد سے رینگنے لگے۔ لیکن باغ سے بچ کر نکل بھاگنے والوں کے لئے یہی ایک راستہ تھا اور لوگوں کا شمار لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جس شخص کے سامنے جگہ بنتی وہ سر کے بل گر کر اژدھوں کے اس جلوس میں شامل ہو جاتا اور تم جانتے ہو بچو کہ ہم مچھیروں کے لئے یہ کام معمولی ہوتا ہے۔ میں ابھی چھ سال کا تھا کہ میرے باپ نے اس کی روح کو ثواب پہنچے' مجھے پانی کی سطح پر اوندھے منہ لیٹ کر بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مردے کی طرح تیرنے کا ڈھنگ سکھایا تھا۔ اس لئے جب میری باری آئی تو میں پھرتی اور آسانی سے رینگنے لگا۔ لیکن گولیوں کی زد سے بچنے کے لئے مجھے اپنا سر زمین میں گاڑنا پڑا جس سے میری کھوپڑی زخمی ہوئی اور کئی دن تک سوجی رہی۔ پھر بھی میں نے یہ کام ہوشیاری اور چالاکی سے سرانجام دیا' مگر میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ جو بڈھا رینگ رہا تھا اس کے سر پر ایک بال بھی نہ تھا اور کھوپڑی سے خون بہہ رہا تھا' اس کا ایک گال مٹی میں دبا ہوا اپنے پیچھے ایک گہری لکیر چھوڑتا جا رہا تھا اور وہ بچوں کی طرح بھونڈے پن کے ساتھ رو رہا تھا۔ راستے کے اختتام پر ہم اٹھ کر بھاگے تو میں نے دیکھا کہ [illegible] اور اس کے تین جوان بیٹے تھے اور پنساری کی بہت بڑی دکان تھی۔ اس کے بعد میں اس طرف نہیں گیا لیکن میں نے دور سے کئی بار دیکھا۔ ایک مدت تک لوگ وہاں سے اسی انداز میں لیٹ کر گزرتے رہے جو انسانوں کی آمد و رفت کا سخت معیوب طریقہ ہے۔ میری آبائی نوکری بھی اس راستے چھوٹ گئی۔

''اب تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے بچو۔ کیونکہ ابھی یہاں پر کرفیو لگ جائے گا اور اس کے بعد بارہ گھنٹے تک جو بھی یہاں پایا گیا اسے گولی مار دی جائے گی۔ میں نے کافی مغز ماری کی ہے۔ لیکن تم نے خود ہی کہا تھا 'بڈھے' ہم کو سب کچھ بتاؤ۔ مگر تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں نے اس سے بڑے بڑے موقعے دیکھے ہیں اور یہ باتیں میرے لئے معمولی ہیں۔''

''تم یہاں سے نہیں اٹھو گے بابا؟'' ایک سننے والے نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''تم ہندو ہو یا مسلمان؟'' نعیم نے جلدی سے سوال کیا۔

''آہا...... یہ اچھا سوال ہے۔'' وہ انگلی اٹھا کر ہنسا۔ ''یہ اچھا سوال ہے۔ واقعی۔ لیکن مجھے پتا نہیں۔ یہ کچھ اور ہی ایسا ہے کہ میں مصروف ہی رہا۔ میرا باپ بھی مصروف آدمی تھا۔ مچھیرے کا کام دراصل جان توڑ کام ہوتا ہے۔ ادھر اُدھر کی باتوں پر تم دھیان ہی نہیں دے سکتے۔'' اس نے گورے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے

انہیں بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ مجھے کچھ نہیں کہتے۔ میں آدھی آدھی رات تک یہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ یہ جانتے ہیں کہ میں ان باتوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ میں مچھلی بیچنے والا بڑھا ہوں۔"

واپس آتے ہوئے وہ دیر تک مڑ مڑ کر اس سیاہ مختصر ہیولے کو دیکھتے رہے جو اس سال خوردہ بڈھے کا تھا جو باتیں کر کر کے تھک چکا تھا اور اب سکون سے دیوار پر تنہا بیٹھا تھا اور ایک غیر آباد رات اس کے چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ رات ان کے درمیان حائل ہو گئی تھی اور وہ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن اس شام کے بعد کئی برسوں تک دیوار پر بیٹھا ہوا وہ اکلوتا' سیاہ جسم ان پانچوں کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔

پنجاب کا دورہ ختم کرنے کے بعد سال کے آخری دنوں میں نعیم اور عذرا لاہور سٹیشن سے دلی جانے والی رات کی گاڑی پر سوار ہوئے۔ جس کمرے میں وہ چڑھے تھے اس کی تمام سیٹیں کھچے ہوئے مسافروں سے گھری ہوئی تھیں۔ سوائے ایک سب سے اوپر والی نشست کی۔ تمام رات دونوں میاں بیوی کو ایک ہی سیٹ میں بسر کرنا تھی' لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ وہ اوپر چڑھے اور لحاف میں گھس کر سو گئے۔ جگہ کم تھی اور گاڑی انہیں بری طرح ہلا رہی تھی لیکن اتنا عرصہ ایک مصیبت زدہ خطے میں بسر کرنے کے بعد گھر واپس جانے کے خیال سے ان کے اعصاب مکمل [illegible]

جب عذرا جاگی تو لحاف کے اندر آنکھیں کھول کر اس نے کونوں کناروں میں سے داخل ہوتی ہوئی دن کی روشنی کو دیکھا اور اسے کافی وقت گزر جانے کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی بہت سی اونچی مردانہ آوازوں کا شور اس کے کان میں پڑا۔ اس نے لحاف کا کونا اٹھا کر دیکھا۔ یہ شور چند فوجی افسروں کی باتوں کا تھا جو سب کے سب غیر ملکی تھے۔ وہ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر آمنے سامنے دو نچلی سیٹوں پر جمع تھے۔ ان میں سے دو پورے فوجی لباس میں تھے' تین کو ان کے ہندوستانی بیرے لباس پہنا رہے تھے۔ اور باقی دو جو طور اطوار سے فوجی افسر ہی معلوم ہوتے تھے' رات کے لباس میں پاس پاس بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ رات کے لباس میں ایک اور شخص بھی تھا جو ان کے پاس ہی سیٹ پر بیٹھا بظاہر ان کی باتوں سے لاتعلق ایک انگریزی کتاب پڑھ رہا تھا اور پائپ پی رہا تھا۔ دو سیٹوں کے درمیان ایک چھوٹی سی میز پر شیمپین کی بوتل رکھی تھی۔ دو افسر' جو لباس پہننے سے فارغ ہو چکے تھے' چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں سے گھونٹ گھونٹ شراب پی رہے تھے اور اونچی' لاپرواہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ صبح کی نرم دھوپ کھڑکی کے شیشوں میں سے اندر آ رہی تھی اور گاڑی تیزی سے آموں کے ایک باغ کے پاس سے گزر رہی تھی۔ عذرا نے انبالہ کے گرد و نواح کے آم کے باغوں سے ڈھکے ہوئے علاقے کو دیکھا اور دل میں گھر واپس آنے کی خوشی' جو ہر انسان کو ہوتی ہے' محسوس کی۔ اس نے شفقت اور مہربانی کی نظر نعیم پر ڈالی جو بچوں کی طرح سو رہا تھا۔ وہ دیر تک خاموش لیٹی اس کے جسم کی گرمی کو جذب کرتی رہی۔

اچانک ایک مانوس نام سن کر اس نے کان کھڑے کیے۔ اس کا تذکرہ اس انگریز فوجی نے کیا تھا جو گلابی لکیروں والا پاجامہ اور ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے تھا اور سب سے اونچی آواز میں سب سے زیادہ جارحانہ انداز میں بول رہا تھا:

''لاہور میں میں نے ہنٹر کمیٹی کو بتایا کہ مجھ میں کتنی انسانیت ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''ورنہ۔''

''بالکل درست ہے۔'' دوسرے فوجی نے انگلی سیدھی کر کے کہا۔ ''ورنہ کون نہیں جانتا کہ کیا کچھ کیا جاسکتا تھا۔''

''میں ہندوستانیوں کے اس مقدس شہر کو جلا کر راکھ کر سکتا تھا اور ان کا طرزِ عمل دیکھ کر میرے جی میں آیا کہ اس قانون شکن اور باغی ہجوم کو نیست و نابود کر دوں اور ان کے بچوں اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ لیکن محض انسانی رحم و کرم اور خدا ترسی کے جذبے نے مجھے روک لیا۔ میں نے ایک لاقانون قوم کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ پر انکوائری بٹھائی گئی۔''

''یہ انکوائری کمیٹیوں کے لوگ انتہائی جاہل ہوتے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ ان میں سے کسی کو اگر تمہاری جگہ پر کھڑا کر دیا جائے تو وہ وہی کرے گا جو کچھ تم نے کیا۔ بہرحال اب اس قصے کو ختم کرو اور اپنی کامیابی کا جام نوش کرو۔''

اس تجویز کا ایک عام اظہارِ مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور سب فوجیوں نے جن میں کتاب پڑھنے والا اور تین لباس پہننے والے بھی شامل تھے آگے بڑھ کر اپنے اپنے گلاس اٹھائے۔ اس تجویز کے بانی نے ہر ایک کے گلاس میں باقی [illegible] کا نعرہ لگایا اور غٹاغٹ پی گئے۔ اس کے بعد ڈریسنگ گاؤن والا پھر جوشیلے اعصابی لہجے میں تیز تیز باتیں کرنے لگا۔ نعیم اور عذرا کو یہ جاننے میں دقت نہ ہوئی کہ وہ شخص جلیانوالا باغ کا فاتح بریگیڈیر جنرل ڈائر تھا۔ دلی سٹیشن پر وہ اسی لباس میں اتر گیا۔

عذرا اس کی شاندار شخصیت اور جارحانہ انداز سے مرعوب ہوئی لیکن نعیم کے ہاتھ اسے مار گرانے کے لئے کانپنے لگے۔

(۳۰)

روشن آغا متواتر ایک گھنٹے سے بالائی منزل کی بالکونیوں میں چکر لگا رہے تھے۔ اسی طرح وہ پچھلے چند گھنٹوں میں روشن محل کے تمام برآمدوں، غلام گردشوں اور خالی کمروں میں گھوم چکے تھے۔ سر نیہوڑائے ہاتھ پیچھے باندھے وہ گہرے متفکر انداز میں چل رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ پشت پر سے کھول کر بازوؤں کو سینے پر باندھ لیتے اور پھر سیدھے چھوڑ کر چلنے لگتے۔ باہر ڈرائیو کے آخر پر موٹر گاڑیوں اور بگھیوں کی ایک قطار کھڑی تھی اور ان میں آنے والے ڈاکٹر اور رئیس گھر کے دوسرے افراد کے ہمراہ جن میں نعیم اور عذرا بھی شامل تھے، گول کمرے میں جمع تھے۔

تمام ڈاکٹر اطمینان سے بیٹھے اخبار اور ذاتی کاغذات دیکھ رہے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ گھر کے لوگوں کے چہروں پر سراسیمگی کے آثار تھے اور وہ بے چینی سے وقت کے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کبھی کبھی بے داغ لباس میں کوئی نرس بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی آ کر کسی ڈاکٹر کی کرسی پر جھک جاتی اور کھسر پھسر کرنے کے بعد اسی سمت میں غائب ہو جاتی۔ ڈاکٹر اکتائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا اور پھر کاغذات پر جھک جاتا۔ اندر بڑے بڑے طویل کمروں کے پیچھے کہیں سے دھیما' مکھیوں کے بھنبھنانے کا سا شور اٹھ رہا تھا۔ مختصر وقفوں پر اس کو چیرتی ہوئی ایک تیز' درد آلود چیخ بڑے کمرے تک پہنچتی' جو گھر والوں کے چہرے زرد اور ڈاکٹروں کی اکتاہٹ میں اضافہ کر دیتی۔

باہر برآمدوں' زینوں اور گیلریوں میں گھر کے نوکر' مہریاں اور مالی ایک بیکار مصروفیت کے ساتھ ایک دوسرے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ خاص طور پر عورتیں خاموش ہنسی سے گال پھلاتی ہوئی مسلسل اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں اور اپنے خاوندوں کے علاوہ دوسرے مردوں کے قریب سے گزرتے ہوئے بے وجہ طور پر مسکرائے جاتی تھیں۔ ان کے بازو چاندی کے موٹے موٹے کڑوں اور کنگنیوں سے کہنیوں تک چھپے ہوئے تھے اور شور کرنے کے ڈر سے وہ انہیں تھامے ہوئے تھیں۔ روشن آغا کو لکڑی کے بڑے زینے پر سے اترتے ہوئے دیکھ کر وہ سب سایوں کی طرح کمروں میں غائب ہو گئے۔

انہوں نے دونوں ہاتھ اونی ڈریسنگ گاؤن کی جیبوں میں گہرے ٹھونس رکھے تھے اور تیز اعصابی چال سے چل رہے تھے۔ [illegible] میں پہنچے۔ ایک سفید فام نرس ایک سفید فام ڈاکٹر سے ہدایات لے کر واپس جا رہی تھی۔ اس کے غائب ہوتے ہی وہ اذیت ناک چیخ بلند ہوئی۔ روشن آغا عجلت سے مڑ کر چلنے لگے۔ برآمدے کی لمبائی طے کرتے ہوئے وہ ایک جگہ پر رکے' پام کے پتوں کو توڑ کر دانتوں میں چبایا' ناخنوں سے برآمدے کے ستون پر لکیریں کھینچیں اور زرد رنگ کی بیل میں سے چڑیوں کو اڑایا۔ جب وہ دوبارہ دروازے کے سامنے سے گزرے تو ان کے دوست ڈاکٹر انصاری اٹھ کر ان سے آ ملے۔

"ہلو روشن آغا۔" سنہرے رنگ کی سگار دانی کھول کر بڑھاتے ہوئے وہ بولے۔

"نہیں ڈاکٹر' شکریہ۔ تمبا کو کی خواہش نہیں ہے لیکن ڈاکٹر...... پہلے بھی میرے دو بچے ہو چکے ہیں' پر یہ حالت میری کبھی نہیں ہوئی۔" انہوں نے ایک تھکی ہوئی سانس چھوڑی۔ "شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔"

ڈاکٹر نیم تمسخر' نیم سنجیدگی سے ہنسا: "بوڑھے تو ہم سب ہو رہے ہیں۔ پر یہ کوئی ایسی بات نہیں۔"

"لیکن کیا یہ ممکن ہے ڈاکٹر......" انہوں نے رک کر پوچھا۔ "کہ...... یعنی آخری بچے سے کم و بیش بیس سال کے بعد' یعنی...... کیا تمہیں یقین ہے کہ......"

"یقیناً......" ڈاکٹر انصاری نے سگار کا دھواں پام کے پتوں پر چھوڑا۔ "میں نے ایسے کیس بھی دیکھے ہیں جب شادی کے چالیس برس کے بعد پہلا بچہ ہوا۔"

"مضحکہ خیز...... قطعی مضحکہ خیز۔" روشن آغا کپکپاتی ہوئی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولے۔ "لیکن میں نے

زندگی بھر ایک دن میں اتنا پیدل سفر طے نہیں کیا ہے جتنا کہ آج۔ ڈاکٹر۔“

”اطمینان رکھو۔ اب وقت گزرا ہی چاہتا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد روشن آغا کو اسی طرح برآمدے میں چکر لگاتے ہوئے چھوڑ کر وہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ جب اندر سے آنے والی چیخیں بلند ہو گئیں تو عذرا نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے جھک کر نعیم کے کان میں کچھ کہا۔ نعیم اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اسے دیکھ کر روشن آغا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دو ایک دفعہ کچھ کہنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا‘ پھر سر جھکا کر چلنے لگے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر اب انہوں نے اسے برابر کے آدمی کی طرح مخاطب کرنے کے خیال کو قبول کر لیا تھا۔ اب وہ ان میں سے تھا۔

دو دفعہ برآمدے کی لمبائی طے کرنے کے بعد آخر نعیم بولا: ”ہمارا پنجاب کا دورہ خاصا کامیاب رہا۔“

”ہاں ہاں‘ پنجاب میں تم لوگوں نے بڑے دن لگائے۔ کیا نتیجہ نکلا؟“

”کمیٹی نے تمام اہم اور قابل اعتماد لوگوں سے رابطہ قائم کیا جن سے ہمیں چشم دید حالات معلوم کرنے کا موقع ملا۔ گورنمنٹ کے اعلان کے مطابق چار سو آدمی مرے اور زخمی ہوئے۔ فی الواقع مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔“

”ہوں۔“ روشن آغا تشویش سے بولے۔ ”تشدد! انکوائری کمیٹی میں اور کون لوگ تھے؟“

”پنجاب [illegible] عنقریب شائع ہونے والی ہے۔“

UrduPhoto.com

”پنجاب کے حالات میں مجھے بڑی دلچسپی ہے لیکن اس وقت۔“ انہوں نے ہاتھ سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس معاملے نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ میں کبھی اتنا پیدل نہیں چلا۔“

نعیم نے ایک قریبی عزیز کی طرح چند باتیں ان کی تسلی کے لئے کہیں اور کمرے میں واپس آ گیا۔ اب عذرا اٹھ کر باہر جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اندر سے چیخوں کی آواز آنی بند ہو گئی اور شہد کی مکھیوں کا شور آہستہ آہستہ قریب آنے لگا۔ ڈاکٹروں نے اپنے اپنے کاغذوں اور سگریٹ تپائیوں پر رکھ دیے اور جنہوں نے چشمے لگا رکھے تھے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ گھر کے باقی افراد اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے‘ باہر نوکروں میں کھلبلی مچ گئی۔ اندر سے دو نرسیں نکلیں اور اپنے اپنے ڈاکٹروں کو جا کر خوشخبری دی۔ ان کے پیچھے پیچھے خالہ نمودار ہوئیں اور تیزی سے کمرہ پار کر کے برآمدے میں پہنچیں‘ ایڑیاں اٹھا کر دونوں ہاتھ روشن آغا کے کندھوں پر رکھے اور بولیں: ”بیگم محفوظ ہیں۔ آپ کو یاد کر رہی ہیں۔“

”اوہ..... سچ؟“ انہوں نے دونوں بازو برآمدے میں پھیلائے۔ پھر اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں خالہ کا ہاتھ دبوچ لیا اور اسے منہ کے قریب لا کر چوما۔ ”آہ! یہ اذیت ناک وقت تھا۔ رب امجد۔“

ڈاکٹر انصاری ان کی طرف آئے: ”مبارک ہو روشن آغا۔ آپ بچی کو دیکھ سکتے ہیں۔ زچہ کی حالت بالکل

طور پر تسلی بخش ہے۔"

"مبارک ہو ۔۔۔۔ مبارک ہو۔" پکارتے ہوئے روشن آغا دروازے کی طرف بڑھے' دہلیز پر پہنچ کر رکے' پھر پلٹ کر برآمدے میں پڑی ہوئی بید کی لمبی کرسی پر دراز ہو گئے۔ گاڑیاں ایک ایک کر کے رخصت ہو رہی تھیں۔ آرام وہ کرسی پر پوری طرح پھیل کر انہوں نے پاؤں ٹھنڈے فرش پر رکھے اور آنکھیں بند کر لیں۔ سب لوگ اندر کے کمروں کی طرف چلے گئے۔ آہستہ آہستہ برآمدے میں سناٹا چھا گیا۔ چند منٹ کے اندر اندر روشن آغا کا سر چھاتی پر ڈھلک آیا اور وہ اونگھنے لگے۔

صرف نوکروں میں ایک خاموش کھلبلی مچی رہی۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے کبھی اندر کے کمروں میں جھانکتے اور کبھی طویل خالی برآمدے میں دیکھتے' جہاں روشن آغا تنہا سو رہے تھے اور ان کا ملازم خاص خاموش اشاروں سے ان چڑیوں کو اڑا رہا تھا جو برآمدے کی بیلوں اور پام کے پتوں میں شور کرنا چاہتی تھیں۔

وہ آگ' جو بڑے پگڑی والے نے امرتسر میں دیکھی تھی' آہستہ آہستہ ملک بھر میں پھیل گئی۔

یہ سال نعیم اور اس کی بیوی کسانوں میں پھرتے رہے اور انہوں نے ایک بہت بڑی بدلتی ہوئی دنیا دیکھی۔ سر اٹھاتے اور کمر سیدھی کرتے ہوئے کسانوں کی دنیا جو تیزی سے بدل رہی تھی' اور اپنی حیثیت اور طاقت کا علم جو [illegible] چاچا رہا تھا۔ [illegible] کسانوں کی کساں روشن آغا کے علم سے باہر تھی اور عذرا کے لئے کسانوں اور ان کی زندگیوں میں کوئی کشش نہ تھی پھر بھی اپنے خاوند کے ہمراہ بہر حال وہ پھرتی رہی اور اپنے دیہاتی گھر کو مرکز بنا کر انہوں نے چاروں طرف اپنا کام جاری رکھا۔

ہندوستان کے شدید موسموں میں وہ دور دور کے گاؤں میں پیدل چل کر پیدل پہنچے اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے مخاطب ہوئے۔ کسان جو نعیم اور اس کی طرح کے ہزاروں کارکنوں کی کوششوں سے اب ان کی باتوں کا مطلب سمجھنے لگے تھے' ان کے گرد جمع ہوتے اور ان کی عدم تعاون کی ہدایتوں کو خاموشی اور جذبے کے ساتھ سنتے۔ پہلے پہل ان کو یہ باتیں وحشت ناک معلوم ہوئیں' کیونکہ ان باتوں میں کوئی فلسفہ نہ تھا اور یہ سیدھی سادی' ننگی بغاوت کی باتیں تھیں۔ ان پڑھ اور پیدائشی لاعلم کسانوں کے لئے یہ قبول کرنا بڑا مشکل کام تھا کہ ان کی زمینوں کا مالک' جاگیردار' ان کا محسن نہیں بلکہ دشمن تھا۔ جب پہلے پہل انہوں نے یہ باتیں سننا شروع کیں تو ٹیکس کی عدم ادائیگی اور زمیندار کو اس کے واجبی حصے سے زیادہ اناج نہ دینے کے خیال سے ان کے دل میں خوف اور ہراسانی کے جذبات پیدا ہوئے اور انہوں نے ان لوگوں کو کہ جو یہ سبق دیتے تھے مجرم تصور کیا' پر اس کے ساتھ ہی دل کے چور میں انہیں یہ ساری باتیں بھا گئیں اور چھوٹی بڑی انسانی مسرتوں اور آسائشوں کی چاہ نے' جن سے وہ اب تک محروم رہے تھے' کیڑوں کی طرح ان کے سینے میں خلش پیدا کرنا شروع کی اور انہوں نے باہر سے آنے والے ان لوگوں کو عقیدت کی نظروں سے دیکھا۔ لیکن زندگی کا خوف' جو ان کی نس نس میں بس چکا تھا' ان پر چھایا رہا

UrduPhoto.com

تھا اور انہوں نے ان لوگوں کو اپنے سے علیحدہ اور مختلف انسان سمجھا اور ان کے قریب آنے سے گھبراتے رہے۔

لیکن انہی لوگوں نے جب بھوک اور پیاس کا اظہار کیا' ان کے پاس بیٹھ کر کھانا کھایا اور پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا' ان کے کھیتوں اور کھلیانوں میں بیٹھ کر حقہ پیا اور ان سے باتیں کیں' ان کی فصلوں اور مویشیوں کی بیماریوں کے بارے میں پوچھا اور مشورے دیئے' ان کے ہمراہ زمین پر سو کر راتیں بسر کیں' اور سب کے ساتھ مل کر گایا' اور کسانوں کی سادہ' بے فن قصے کہانیاں سنیں اور محظوظ ہوئے' ان کے کھیتوں میں چھوٹے موٹے کام کرنے میں مدد کی اور وہ سب کچھ کیا جو ہر کسان کرتا ہے تو ان کا عمومی پن سب پر واضح ہو گیا اور انہوں نے نئے سرے سے ان کی باتیں سنیں جنہوں نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ملک کے لاکھوں کھیتوں میں جھک کر کام کرتے ہوئے کروڑوں کسانوں نے سر اٹھایا اور کمر سیدھی کی اور غرور سے ابرو پر انگلی پھیر کر پسینہ خشک کیا۔ یہ ہندوستان کا بدنصیب کسان تھا جس نے ان گنت مصیبتیں بغیر احساس کے جھیلی تھیں۔ اس کے چہرے پر بے شمار لکیریں اور گہری تھکن کے آثار تھے اور اس کا جسم موسموں کی شدت میں ننگا رہ کر قرمزی' نیلا اور سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس کے حصے کا اناج زمینداروں کے گھروں میں تھا اور اس کی عورتوں کے زیور مہاجنوں کے پاس رہن رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور وہ نادار تھا' اس کی ملکیت میں ایک درانتی اور ایک کدال تھی اور اس کے ہاتھوں میں اپنی محنت تھی۔ اس پر جو آفتیں نازل ہوئیں ان میں سبھی کچھ شامل تھا۔ زمیندار اور مہاجن سے لے کر خشک سالی' سیلاب' بیماری' وبا' اور بھوک تک۔ ہندوستانی کسان میں صدمے برداشت کرنے کی حیرت ناک قوت ہوتی ہے۔ ہر تھپیڑے کے ساتھ وہ ذرا اور جھک جاتا اور گزر جانے پر پھر کھڑا ہو کر سیدھے کر لیتا۔ لیکن اس کی کمر سیدھی کرنے اور سر اٹھانے کے لئے ایک بیرونی طاقت کی ضرورت تھی جو سالہا سال کی مظلومیت کا طوفان اس کے اندر سے نکالتی اور اسے ان مصائب سے آگاہ کرتی جو کہ وہ بغیر احساس اور علم کے جھیل رہا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو ملک کی تین چوتھائی آبادی پر مشتمل تھا اور جس پر ملک کی تمام خوراک اور بندوبست کا انحصار تھا۔ آخر جب حالات اور واقعات کے زور سے وہ بیرونی طاقت میسر آ گئی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مظلومیت کا احساس غصے اور نفرت کی قوت میں تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے اپنے آلام زدہ مقدر کو محسوس کیا اور یہ بڑی بات تھی۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار کسان نے اپنی حیثیت بیل سے بلندتر خیال کی۔

اور اس سے بڑی بات یہ کہ انہیں اپنی طاقت کا علم ہوا۔ ایک گاؤں میں جہاں چند ماہ پیشتر سیلاب نے تباہی مچا دی تھی اور اناج کا ایک دانہ تک کھیتوں میں نہ ملا تھا' نعیم کو رہتے ہوئے پانچ روز ہو چکے تھے۔ گاؤں میں قحط سالی کا عالم تھا اور مٹھی بھر اناج پر کسانوں کا پورا پورا خاندان گزران کر رہا تھا۔ اس وقت زمیندار کے کارندے گزشتہ فصل کی مقررہ مقدار کی عدم ادائیگی پر ٹیکس وصول کرنے اور دوسری صورت میں قرضے کے اندراج پر کاشت کاروں کے نشان انگوٹھا حاصل کرنے کی غرض سے وارد ہوئے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے اور ہر ایک دروازے پر رک کر اونچی' درشت آوازوں میں مطالبہ کر رہے تھے۔ ان سے ذرا فاصلے پر ایک کھلیان میں گاؤں کے زیادہ تر مرد

UrduPhoto.com

جمع تھے۔ یہ وہ کسان تھے دو یا دو سے زیادہ دن سے ٹھوس خوراک کی کوئی مقدار جن کے حلق سے نہ اتری تھی۔ وہ سب کھلیان کے ننگے فرش پر بیٹھے تھے جہاں سے گھاس اور بھوسے کا آخری تنکا تک اٹھا کر مویشیوں کو ڈال دیا گیا تھا۔ نعیم درمیان میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور چاروں طرف وہ سب خاموش بیٹھے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے فاقہ زدہ تھے اور وہ ایسے پرندوں کی طرح تھے جو طوفان باد و باراں میں گھر گئے ہوں۔

جب چلاتے ہوئے کسانوں کی آوازیں قریب آنے لگیں تو کسانوں کے چہروں پر سارے جسم کا بچا کھچا لہو اکٹھا ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ آوازیں کھلیان کی دیوار کے پاس آ گئیں۔ دیوار کے پیچھے سے ایک عورت کے رونے کی آواز آئی جو کہہ رہی تھی: ''میرا خاوند گھر پر نہیں ہے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔'' جواب میں وہی درشت آوازیں گالیاں دیتی ہوئی سنائی دیں اور ایک شخص اندر داخل ہو کر کسی بھاری شے سے دیواریں ٹھونکنے لگا جس سے اس گھر اور کھلیان کی مشترکہ دیوار ہلنے لگی۔ ملی جلی آوازوں کا شور بلند ہو گیا: ''آنسو مت بہا۔ تیرا خاوند کہاں ہے؟ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ دیکھ لو، میرا خاوند گھر پر نہیں۔ چور بہانے باز۔ کتیا کی اولاد۔''

ایک کسان کھلیان میں سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سارے کسان نکل کر دروازے پر جمع ہو گئے۔ نعیم کھلیان میں اکیلا رہ گیا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو۔ کام چور۔'' ایک گھڑ سوار نے چلا کر پوچھا۔

وہ [illegible] گھوڑے [illegible] دیکھتے رہے۔

UrduPhoto.com

''تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے؟ یا تمہارا کوئی عزیز مر گیا ہے۔'' گھڑ سوار دوبارہ چلایا۔ پھر کوئی جواب نہ پا کر وہ کود کر گھوڑے سے اترا اور چابک ہوا میں لہرا کر چلایا: ''فصل کا حساب دو۔''

''ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔'' پہلے کسان نے کہا۔

''کیوں نہیں ہے؟'' غصے سے اندھا ہو کر وہ دوبارہ کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور چابک کو پوری طاقت سے ہوا میں نچانے لگا۔ گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر اٹھ کھڑا ہوا۔

انتہائی نفرت اور غصے کے زیر اثر کسان ایک لمحے کے لئے گنگ رہ گیا اور تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح سانس لینے لگا۔ پھر اس کے گلے سے تیز پھٹی ہوئی آواز نکلی:

''کیوں نہیں ہے؟ ہیں؟ یہ دیکھو......'' اس نے پاس بندھے ہوئے بیل کے پہلو میں چاروں انگلیاں اتار دیں جو اس کی ننگی پسلیوں میں غائب ہو گئیں۔ بیل دہشت زدہ آواز میں ڈکرایا۔ ''اور یہ......'' اس نے اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھایا۔

اور یہ ایک خوفناک نظارہ تھا جس کا حال وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے فاقہ زدہ انسانی جسم دیکھے ہیں۔ اپنی پسلیوں میں اس کی انگلیاں ایک ایک پور تک اتر گئیں۔

''سؤر۔'' وہ اسی پھٹی ہوئی آواز میں چیخا۔ ''بھاگ جاؤ۔ جاؤ...... ہم آگ لگا دیں گے۔ کھلیانوں کو......

گھروں کو......سب کو۔"

کسانوں میں جانوروں کے گلے کی سی بلبلاہٹ بلند ہوئی اور وہ خالی ہاتھ اوپر اٹھا کر بڑھے۔ سواروں نے ٹھٹک کر دیکھا اور خاموشی سے گھوڑے موڑ کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد کوئی اس فصل کا حساب وصول کرنے کے لئے نہ آیا اور اس چھوٹی موٹی بغاوت کو عمداً نظر انداز کر دیا گیا۔

جب موسم میں ذرا شدت آئی تو عذرا نے جو پہلے ہی دیہات اور دیہاتیوں سے میل جول رکھنے سے اکتا چکی تھی' اپنے خاوند کے ہمراہ جانا چھوڑ دیا اور روشن پور میں بیٹھ کر اپنے دل میں شہری زندگی کی چمک دمک اور شہرت کی خواہشات کے زہر کو پالنے لگی۔ جب بھی نعیم پھر پھرا کر اور عذرا کی کشش سے مجبور ہو کر گھر آتا تو وہ اس سے کہتی: "تم گاؤں گاؤں پھرا کرتے ہو پہلے اپنے مزارعوں کو زمینیں بانٹو۔" اس پر وہ جواب دیتا: "یہ سب روشن آغا کے مزارعے ہیں۔ میرے کوئی مزارعے نہیں ہیں۔ میری زمینوں پر میرا بھائی اور ماموں کا لڑکا کام کرتے ہیں۔" وہ چپ ہو جاتی۔ لیکن وہ دلی نہ جاتی' کیونکہ اپنے خاوند سے اسے عشق تھا اور وہ محبت کی ادھ مٹی خواہشوں کو لے کر' اکیلی رہتی ہوئی خلش اور جذبے کے ساتھ اس کا انتظار کرتی رہتی۔

نعیم اب مکمل طور پر کسانوں میں گم ہو چکا تھا۔ انفرادی طور پر کسی سے اس کے تعلقات نہ تھے' کیونکہ ایک فردی حیثیت سے کسان موٹے دماغ کا ان پڑھ اور غیر دلچسپ شخص ہوتا ہے اور اس سطح پر وہ نعیم کا دوست نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن [illegible] طور پر [illegible] وفادار پایا۔ ان کا [illegible] والا ہجوم پالتو جانوروں کی طرح برتاؤ کرتا اور دیکھنے والے کے دل میں رحم کے جذبات پیدا کرتا تھا۔ اجتماع کی شکل میں وہ ایک ایسی چھپنے والی قوت کا یقین دلاتے تھے جس پر مکمل بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت ان کا نعرہ صرف ایک تھا۔ "سوراج"۔ اس ایک لفظ میں جو کانگرس نے انہیں دیا تھا' ان کی آئندہ زندگی کی آسائشوں کے تمام مبہم اور غیر مبہم تصورات شامل تھے۔ نعیم اور اس کے ساتھیوں نے یہ بہت بڑا' تیزی سے بدلتا ہوا منظر دیکھا اور محسوس کیا اور خود کو اس میں شریک پا کر محظوظ ہوئے۔

دسمبر کے شروع میں 'پرنس آف ویلز' کے ہندوستانی دورے کے سلسلے میں حکومت نے تمام سیاسی پارٹیوں کو دبانا شروع کیا۔ جب 'انڈین نیشنل کانگرس' نے دورے کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا تو اسے خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ اس پر بھی والنٹیروں کے ناموں کی فہرستیں شائع ہوتی رہیں اور عام ہڑتال اور شاہی خاندان کے ایک فرد کی آمد کے موقع پر حکومت کی طرف سے جاری کردہ تمام احکامات کی خلاف ورزی اور تقریبات کے بائیکاٹ کی ہدایت کے اشتہارات عوام میں تقسیم کئے جاتے رہے۔ نتیجے کے طور پر حکومت کے اعصاب جواب دے گئے اور وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آ گئیں۔

روشن پور میں جس گھر کے دروازے کی تختی پر لکھا تھا: "یہاں نعیم اور اس کی بیوی رہتے ہیں" وہاں پچھلے

چند روز سے عذرا مستقل بے چینی کے ساتھ نعیم کا انتظار کر رہی تھی۔ پرنس آف ویلز کی آمد کا اسے علم ہو چکا تھا اور اسے دیکھنے' اس کے ساتھ باتیں کرنے اور اس کے پاس بیٹھنے کی خواہش نے اس کے دل میں کرب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک لمبی مدت تک وہ اس دنیا سے محروم رہی تھی جس کا کہ وہ باشندہ تھا اور اس دنیا کی کشش کو محسوس کر کے وہ راتوں کو سو بھی نہ سکتی تھی۔ گزشتہ چند ایک طویل' بے خواب راتوں نے اسے بڑی اذیت دی تھی' جن میں اسے نعیم کے جسم کی حسرت اور دلّی کی زندگی سے اپنی محرومی کا شدت کے ساتھ احساس ہوا تھا۔

آخر ایک سہ پہر کو نعیم آ پہنچا۔ اس رات کے لئے وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس رات اس نے اپنے آپ کو محض یہ یقین دلایا کہ اس کا محبوب جسم اس کے قبضے میں ہے اور اب کہیں نہیں جائے گا۔ پو پھٹنے کے وقت نعیم کو ہلتا ہوا پا کر وہ کسمسائی اور اس کے ساتھ لگ کر بولی: ''ہم دلی جائیں گے نعیم۔ پرنس آف ویلز آ رہے ہیں۔ چلیں گے نا؟''

نعیم نے' جو ہلکی ہلکی تکان' بستر کی حرارت اور عذرا کے جسم کی لذت سے مدہوش تھا' صرف اتنا کہا:

''ہاں...... ہاں۔''

لیکن دوسری رات کو جو وہ سونے کے لئے لیٹے تو عذرا کے ذہن میں صرف ایک سوال تھا جو اس نے چھوٹتے ہی کیا۔ ''ہم دلّی جائیں گے نعیم۔''

وہ یوں چونکا جیسے اس نے پہلی دفعہ سنا ہو۔ ''کیوں؟''

'' [illegible] ''

''[illegible]'' اس نے اداسی سے کہا۔ ''اس سے پہلے ہی شاید میں گرفتار ہو جاؤں۔''

''کیوں؟''

''ہم نے بائیکاٹ کیا ہے اس کے دورے کا۔''

''نہیں۔'' عذرا نے بچوں کی طرح کہا۔ ''لیکن نہیں۔ تم گرفتار مت ہونا' ہم دلّی جائیں گے۔ ایں؟''

''دلّی میں کچھ بھی نہ ہوگا۔ وہ جہاں جائے گا وہاں ہڑتالیں کرائی جائیں گی۔ اس کے خلاف مظاہرے ہوں گے۔''

''مگر کیوں؟'' عذرا ششدر رہ گئی۔ ''وہ شاہی خاندان کا اتنا شریف انسان ہے۔ اسے سیاست سے کیا مطلب۔''

''یہ پارٹی کا فیصلہ ہے' عذرا۔ میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔''

نعیم نے آہستہ سے اسے ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اور تم...... تم تو سب کچھ سمجھتی ہو پھر پوچھ رہی ہو؟''

وہ سیدھی لیٹی بے خواب آنکھوں سے چھت کو گھورتی رہی' یہ قطعاً بھول کر کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ لیٹی تھی۔ اس کا جسم سرد تھا اور اس کا خاوند اس کے ذہن سے بالکل نکل چکا تھا۔ عذرا کے جسم کو آہستہ آہستہ دباتے ہوئے نعیم پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

''لیکن نعیم۔'' اچانک عذرا نے کہا۔ ''پھر ہم مظاہرہ کریں گے۔ کر سکتے ہیں ناں!''

UrduPhoto.com

نعیم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی بات ذہن نشین کرتا رہا۔ ''ہاں۔''

''ہاں ہم مظاہرہ کریں گے۔ تم گرفتار مت ہونا' بس۔'' عذرا خوشی سے بولی۔

''لیکن...... روشن آغا تمہیں ایسا کرنے دیں گے؟''

''روشن آغا......؟'' وہ اس کے ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے سوچنے لگی۔ ''ہاں...... اور ر...... ہم کلکتے چلے جائیں گے۔ تمہارے چچا کے ہاں' ٹھیک ہے؟ ٹھیک ہے ناں۔''

''ہاں ٹھیک تو ہے۔'' نعیم نے کمزور آواز میں کہا۔

''ہم کلکتے جائیں گے۔ تم گرفتار مت ہونا۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم گرفتار مت ہونا۔ اچھا؟''

وہ خاموش رہا۔

''تم گرفتار نہیں ہوؤ گے نا۔ وعدہ کرو نا' نعیم۔'' عذرا نے اس کی ٹھوڑی پر ہونٹ رگڑتے ہوئے کہا۔

''وعدہ کرو نا۔''

نعیم نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔ ''اچھا۔'' اس نے جلدی سے کہا اور اپنی بیوی کے غالب آتے ہوئے ارادے سے بچنے کی کوشش میں اس کے جسم کا سہارا تلاش کرنے لگا۔

کلکتے [illegible] بازار میں مکمل ہڑتال تھی لیکن تماشائیوں کا پتلا ہجوم بند دکانوں کے آگے آگے گھوم رہا تھا۔ بازار کے بیچوں بیچ رستہ صاف تھا اور وردیہ غیر ملکی اور مقامی پولیس کے آدمی کھڑے تھے۔ وہ اپنی تقریبی وردیوں میں ملبوس' مستعدی سے سیدھی قطاروں میں کھڑے' خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک پر انگریز فوجی اور پولیس افسر موٹر سائیکلوں پر گھوم رہے تھے۔ پرنس آف ویلز کا جلوس گورنمنٹ ہاؤس سے روانہ ہو چکا تھا۔

شہر کے تمام بازاروں اور گلیوں میں مکمل ہڑتال تھی۔ دکانوں اور گھروں کے دروازے بند تھے اور ان پر شناختی تختیاں الٹی لٹک رہی تھیں۔ لوگوں کی چال بے مصرف اور نگاہیں کوری تھیں اور چالیس لاکھ نفوس پر مشتمل ایشیا کے اس سب سے بڑے شہر میں دنیا کا تمام کاروبار معطل ہو چکا تھا۔ فٹ پاتھ پر پھرنے والوں میں انسانوں کی نسبت مویشیوں اور کتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن عوام کے عدم تعاون کے باوجود فوج اور پولیس کی بھاری تعداد کی مدد سے شہر پر تقریبی رنگ لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ شہزادے کے جلوس کے رستے میں رنگ برنگ کی جھنڈیاں اور غبارے اڑ رہے تھے اور فاصلے فاصلے پر پام کے پتوں اور سرو کے مصنوعی پودوں سے بڑے بڑے استقبالیہ دروازے کھڑے کئے گئے تھے۔

نعیم ایک مدت کے بعد اس شہر میں واپس آیا تھا جو ساری دنیا میں اس کا محبوب شہر تھا۔ جس طرح دنیا میں نادار سے نادار شخص کو اپنے بچپن کا گھر محبوب ہوتا ہے اور جس طرح ان زمانوں کو یاد کرتے وقت اس کے

چہرے پر وہ دمکتا ہوا حسن پیدا ہو جاتا ہے جو لڑکپن کی عمر کے ساتھ مخصوص ہے اس طرح نعیم نے ان سارے زمانوں کو یاد کیا جو گزر چکے تھے۔ جب وہ درمیانے قد کا گورا سا لڑکا تھا اور روزانہ اس راستے سے جہاں پر اس وقت وہ اپنی بیوی کے ہمراہ کھڑا تھا' سکول کو جایا کرتا تھا۔ اور اس کے پاس رنگ برنگ پنسلوں کا ایک ڈبہ تھا جو وہ ہمیشہ اپنے بیگ میں رکھتا اور صرف اپنے خاص خاص دوستوں کو دکھایا کرتا تھا۔ ان میں خوبی یہ تھی کہ جس رنگ کی پنسل تھی اسی رنگ کی اس سے لکھائی بھی ہوتی تھی۔ اور اس کی نیکر کی جیب میں بہت عرصے تک شیشے کی ایک خالی دوات رکھی رہی تھی جس میں اس نے تتلیوں کے چمکدار پر جمع کیے تھے اور رات کو سونے سے پہلے جسے وہ اندھیرے میں جیب سے نکال کر تکیے کے نیچے رکھ لیا کرتا تھا' کیونکہ اس میں اس قدر قیمتی' اس قدر خوبصورت تتلیوں کے پر تھے جو ہاتھ لگانے سے ٹوٹتے تھے۔ پھر ایک روز سمندر کے ساحل پر ریت میں کھیلتے ہوئے وہ دوات کہیں گم ہو گئی اور ہمیشہ کے لئے اسے یاد رہ گئی تھی۔ جیسے گم شدہ محبوب چیزیں ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ اسے تلاش کرتے ہوئے اس نے ریت پر سے بہت سارے چمکدار پتھر اور سیپیاں چن کر جیبوں میں بھر لی تھیں لیکن شیشے کی وہ دوات ہمیشہ اس کے ذہن میں چمکتی رہی اور اس کے ذہن میں اور بھی بہت کچھ تھا جس میں اس کے سکول کے دوست' نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والے گول مٹول بچے اور اس راستے پر یہی لوگ' گندمی اور سیاہ رنگ' موٹے نعیم اور ٹھگنے قد کے یہ لوگ شامل تھے جو آج بھی اسی طرح اس کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ ان کے جسموں پر اسی طرح سفید دھوتیاں لپٹی تھیں اور ان کے [illegible] پیر ننگے تھے۔ یہ اور اسی طرح کی ہزاروں چھوٹی چھوٹی چیزیں۔ ان سب کو یاد کر کے نعیم نے دل میں پرانی یادوں کی خلش محسوس کی' وہ خلش جو ہر شخص' خواہ وہ کسان ہو یا شہری' مہذب ہو یا غیر تہذیب یافتہ' زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور محسوس کرتا ہے۔

سڑک پر اب فوجی گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی آمد و رفت تیز ہو گئی تھی اور قطار میں کھڑے باوردی جوانوں کو فوجی سلامی کی ہدایات دینے والے کڑک کڑک کر بول رہے تھے۔ عذرا نعیم کا بازو تھامے اس کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی اور اس کا چہرہ زرد تھا۔ ان کے اردگرد مجمع کم ہوتا جا رہا تھا۔

''کاغذ تمہاری ساڑھی میں ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''ہاں۔'' عذرا نے اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔ اس کی آواز سے اس کی گھبراہٹ ظاہر تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑی نعیم کے بازو پر اعصابی انگلیاں بجاتی اور ایک ٹانگ ہلاتی رہی۔ پھر منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر آہستہ سے بولی۔ ''کس طرح کریں گے؟''

نعیم نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک موٹی سی عورت اس کے ساتھ ٹکرا گئی۔ وہ درمیانی عمر کی عورت تھی اور ان لوگوں میں سے دکھائی دیتی تھی جو بہت زیادہ جسمانی آسائش اور فربہی کی بدولت خوش شکل سے بدشکل ہو جاتے ہیں۔ وہ پٹڑی پر چہل قدمی کرتے ہوئے ایک بیل سے بچنے کے لئے اس سے ٹکرا گئی تھی حالانکہ نعیم کو اس مضبوط عورت کے بیل سے ڈرنے کی کوئی وجہ دکھائی نہ دی۔ اس نے عورت کی ساڑھی کا گرا ہوا پلو

زمین پر سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھا اور پلپلے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا۔ عورت' جو تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہی تھی' تشکر سے ہنسی اور جلدی سے گزر گئی۔ نعیم نے چند لمحے تک ان لوگوں کے گزرنے کا انتظار کیا' جن کا راستہ عورت اور بیل نے روک رکھا تھا' پھر عذرا کی طرف جھک کر بولا:

''ہمارے پیچھے دکان کا بورڈ میری پیچ میں ہے۔ اس پر لگائیں گے۔''

''اچھا۔'' عذرا نے پیچھے دیکھے بغیر بے خیالی سے کہا اور ایک ٹانگ ہلاتی رہی۔ نعیم نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

''گرفتار تو اسی وقت کر لئے جائیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کہیں مظاہرے سے پہلے ہی نہ پکڑ لئے جائیں۔'' اس نے کہا۔ عذرا نے سنا یا نہیں' اس کا اسے پتا نہ چل سکا۔ وہ اسی طرح سڑک کی طرف منہ کئے' کہیں بھی نہ دیکھتی ہوئی' خاموش کھڑی رہی۔

اس کے بعد وہ زیادہ تر خاموش رہے۔ کبھی کبھی چھلکتی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔ ان کے سامنے سے گزرتی ہوئی شہریوں کی ایک ٹولی ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ سب کے سب خالص بنگالی باشندے تھے اور بڑی فرصت سے سڑک کا نظارہ کرتے اور آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مگر اب وہ اچانک خاموش ہو کر ایک شخص کو دیکھ رہے تھے جو ان کے درمیان آ کر رک گیا تھا۔ اس نے سفید کھدر کا لباس پہن رکھا تھا اور [illegible] ہوا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟ یہاں کیوں جمع ہو؟'' وہ چاروں طرف دیکھ کر دبی ہوئی غصیلی آواز میں بولا۔ ''دکانیں اس لئے بند کی تھیں کہ ان کا استقبال کرو؟ جاؤ..... چلے جاؤ' ایک ایک شخص' خدا کے لئے۔''

آناً فاناً وہ ٹولی تتر بتر ہو گئی۔ غالباً اس کی طرح کے اور بھی کئی لوگ وہاں پہنچے تھے جو انہوں نے جگہ جگہ پر کھڑی ہوئی اور حرکت کرتی ہوئی کئی ٹولیوں کو بکھرتے اور غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ ہر طرف سے لوگ گلیوں میں اور بازار کے موڑوں پر نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے پٹریاں ویران ہو گئیں اور شہری لباس میں انسان کی شکل خال خال نظر آنے لگی۔ ان کے اردگرد کتے اور بیل پھرنے لگے۔ کچھ وقت اسی ویرانی کے عالم میں گزر گیا۔ پھر انہوں نے ایک فوجی لاری موڑ پر سے نمودار ہوتی اور زن سے گزرتی ہوئی دیکھی جس کے پیچھے وہی کھدر کے لباس والا شخص اور اس کے تین ساتھی بیٹھے تھے۔ ان کے اوپر دو مسلح گورے سپاہی کھڑے تھے۔ کھدر پوش خاموش' مطمئن نظروں سے باہر کو دیکھ رہے تھے۔ نعیم نے ہولے سے مسکرا کر عذرا کو دیکھا۔ وہ لاری پر سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھ رہی تھی' زرد رو اور نروس! اسی وقت بازار کے دوسرے سرے سے پرنس آف ویلز کا جلوس داخل ہوا۔

کاشن دینے والوں کی کڑک دار آوازیں دو رویہ سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی فوجی جوان' جو کھڑے سستا رہے تھے' ہتھیار بجا بجا کر سیدھے' مستعد فوجی انداز میں

UrduPhoto.com

کھڑے ہوتے گئے۔ فوجی بینڈ کی ولولہ انگیز دھن آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ پاپا...... پپا پپا...... قریب' اور قریب' پاپپا...... پپا پپا...... فوجی جوانوں کا جذبہ سرفروشی پھٹنے کی حد تک پہنچ چکا تھا' خون کو گرمانے والی موسیقی کے زیراثر ان کے سخت' اکڑے ہوئے جسموں میں بے پناہ طاقت عود کر آ گئی تھی اور ان کا جی بے اختیار اپنے بادشاہ پر فدا ہو جانے کو چاہ رہا تھا' پاپپا' پپاپپا...... پپ پپا...... پپاپپا۔

نعیم نے پھرتی سے مڑ کر لٹکتا ہوا بورڈ اتارنا چاہا لیکن وہ کیلوں میں الجھ گیا۔ ٹین کے دیوار کے ساتھ ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی۔ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں زیرِ لب کوستے ہوئے نعیم نے اسے زور سے کھینچا جس سے اس کی رسّی ٹوٹ گئی اور وہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ اپنی جگہ پر اکڑا ہوا' اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بینڈ کے شور میں فوج یا پولیس کا کوئی آدمی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اس کی بھٹکتی ہوئی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ جہاں اس نے دیکھا کہ دکانوں کے چوباروں کی کھڑکیوں کے پٹ نیم وا تھے اور ان میں سے سینکڑوں چمکتی ہوئی آنکھیں چوروں کی طرح جھانک رہی تھیں۔ نعیم نے کہنی عذرا کے پہلو میں چبھوئی اور دبی ہوئی آواز میں بولا: "یہ لو...... کاغذ نکالو۔"

وہ دم بخود کھڑی نزدیک آتے ہوئے جلوس کو دیکھتی رہی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟ کاغذ کہاں ہے؟" نعیم نے جھنجھلا کر اس کے کان میں کہا۔

اسی طرف دیکھتے دیکھتے عذرا دھیمی' غیر حاضر آواز میں بولی:

"[illegible]"

"ہاں...... یہ ہے۔"

بینڈ بجاتے ہوئے شاندار وردیوں والے فوجی ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ان کے پیچھے موٹر سائیکل سواروں کا دستہ تھا۔ پھر چار گھوڑوں والی سنہرے رنگ کی رتھ جس میں انگریز شہزادہ گورنر صاحب بہادر کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ ان کے سامنے کی سیٹ پر آگے کی طرف پشت کئے دو انگریز عورتیں بیٹھی تھیں۔ ویلز کا شہزادہ اپنی جگہ پر سیدھا بیٹھا تھا' خوبصورت' متین اور باوقار' جیسا کہ شاہی خاندان کے ایک فرد کو ہونا چاہیے لیکن متردد! اس کے دونوں جانب رتھ کے پائیدانوں پر دو کرانڈیل ہندوستانی باڈی گارڈ سرخ اور سنہری لباس میں مجسموں کی طرح سیدھے ساکت کھڑے تھے۔ ایک بڑی سی سنہری چھتری اس پر سایہ کئے ہوئے تھی۔

اچانک شہزادے نے نظریں اوپر اٹھائیں اور دیکھتا رہا۔ پھر وہ ذرا سا گورنر کی طرف جھکا۔ گورنر نے بھی اسی سمت میں دیکھا اور اس کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف نگاہ دوڑائی' پھر سامنے دیکھا۔ سرو کے مصنوعی درختوں سے بنے ہوئے تقریبی گیٹ کی لکڑی پر برقی روشنی سے لکھے ہوئے یہ الفاظ بار بار ظاہر اور غائب ہو رہے تھے:

"Tell your Mother, we are unhappy"

گورنر پیچھے کی طرف دیکھتا تو حروف غائب ہو جاتے' سامنے دیکھتا تو ابھر آتے۔ اس پُراسرار روشنی کے